قرآن مجید اور اخلاقی تربیت

گروہ محققین

اخلاق ان صفات اور افعال کو کہا جاتا ہے جو انسان کی زندگی میں اس قدر رچ بس جاتے ہیں کہ غیر ارادی طور پر بھی ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں، بہادر، فطری طور پر میدان کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور بزدل طبیعی انداز سے پرچھائیوں سے ڈرنے لگتا ہے، کریم کا ہاتھ خود بخود جیب کی طرف بڑھ جاتا ہے اور بخیل کے چہرے پر سائل کی صورت دیکھ کر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں، اسلام نے غیر شعوری اور غیر ارادی اخلاقیات کو شعوری اور ارادی بنانے کا کام بھی انجام دیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان ان صفات کو اپنے شعور اور ارادہ کے ساتھ پیدا کرے تا کہ ہر اہم سے اہم موقع پر صفت اس کا ساتھ دے ورنہ اگر غیر شعوری طور صفت پیدا بھی کر لی ہے تو حالات کے بدلتے ہی اس کے متغیر ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

مثال کے طور پر ان تذکروں کو ملاحظہ کیا جائے جہاں اسلام نے صاحب ایمان کی اخلاقی تربیت کا سامان فراہم کیا ہے اور یہ چاہا ہے کہ انسان میں اخلاقی جوہر بہترین تربیت اور اعلیٰ ترین شعور کے زیر اثر پیدا ہو۔

قوت تحمل

سخت ترین حالات میں قوت برداشت کا باقی رہ جانا ایک بہترین اخلاقی صفت ہے لیکن یہ صفت بعض اوقات بزدلی اور نافہمی کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات مصائب و مشکلات کی صحیح سنگینی کا اندازہ نہ کرنے کی بنیاد پر، اسلام نے یہ چاہا ہے کہ یہ صفت مکمل شعور کے ساتھ پیدا ہو اور انسان یہ سمجھے کہ قوت تحمل کا مظاہرہ اس کا اخلاقی فرض ہے جسے بہر حال ادا کرنا ہے، تحمل نہ بزدلی اور بے غیرتی کی علامت بننے پائے اور نہ حالات کے صحیح ادراک کے فقدان کی علامت قرار پائے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوفْ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الأَمَوَالِ وَالأنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُواْ إِنَّا لِلّهِ وَإِنَّـا إِلَيْهِ رَاجِعونَ أُولَـئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۱)

یقینا ہم تمہارا امتحان مختصر سے خوف اور بھوک اور جان، مال اور ثمرات کے نقصان کے ذریعہ لیں گے اور پیغمبر آپ صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیں جن کی شان یہ ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں پلٹ کر جانے والے ہیں، انہی افراد کے لیے پروردگار کی طرف سے

صلوات اور رحمت ہے اور یہی ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔

آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید قوت تحمل کی تربیت دینا چاہتا ہے اور مسلمان کو ہر طرح کے امتحان کے لئے تیار کرنا چاہتا ہے اور پھر تحمل کو بزدلی سے الگ کرنے کے لیے ''اِنا للہِ واِنا الیہِ راجِعُون'' کی تعلیم دیتا ہے اور نقص اموال اور انفس کو خسارہ تصور کرنے کے جواب میں صلوات اور رحمت کا وعدہ کرتا ہے تاکہ انسان ہر مادی خسارہ اور نقصان کے لیے آمادہ رہے اور اسے یہ احساس رہے کہ مادی نقصان، نقصان نہیں ہے بلکہ صلوات اور رحمت کا بہترین ذریعہ ہے، انسان میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ عظیم قوت تحمل کا حامل ہو سکتا ہے اور اس میں یہ اخلاقی کمال شعوری اور ارادی طور پر پیدا ہو سکتا ہے اور وہ ہر آن مصائب کا استقبال کرنے کے لیے اپنے نفس کو آمادہ کر سکتا ہے، سورہ آل عمران کی آیت ۱۷۳،۱۷۴ میں ارشاد ہے۔

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُواْ لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَاناً وَقَالُواْ حَسْبُنَا اللّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ فَانقَلَبُواْ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُواْ رِضْوَانَ اللّهِ وَاللّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ

وہ لوگ جن سے کچھ لوگوں نے کہا کہ دشمنوں نے تمہارے لیے بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے خدا کافی ہے اور وہی بہترین محافظ ہے جس کے بعد وہ لوگ نعمت و فضل الٰہی کے ساتھ واپس ہوئے اور انہیں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی اور انہوں نے رضائے الٰہی کی اتباع کی اور اللہ بڑے عظیم فضل کا مالک ہے۔

آیت کریمہ کے ہر لفظ میں ایک نئی اخلاقی تربیت پائی جاتی ہے اور اس سے مسلمان کے دل میں ارادی اخلاق اور قوت برداشت پیدا کرنے کی تلقین کی گئی ہے، دشمن کی طرف سے بے خوف ہو جانا شجاعت کا کمال ہے لیکن حسبنا اللہ کہہ کر بے خوفی کا اعلان کرنا ایمان کا کمال ہے، بے خوف ہو کر نامناسب اور متکبرانہ انداز اختیار کرنا دنیاوی کمال ہے اور رضوان الٰہی کی اتباع کرتے رہنا قرآنی کمال ہے۔

قرآن مجید ایسی ہی اخلاقیات کی تربیت کرنا چاہتا ہے اور مسلمان کو اسی منزل کمال تک لے جانا چاہتا ہے۔

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا(۲)

اور جب صاحبان ایمان نے کفار کے گروہوں کو دیکھا تو برجستہ یہ اعلان کر دیا کہ یہی وہ بات ہے جس کا خدا اور رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور ان کا وعدہ بالکل سچا ہے اور اس اجتماع سے ان کے ایمان اور جذبہ تسلیم میں مزید اضافہ ہو گیا۔

سخت ترین حالات میں قوت برداشت کا باقی رہ جانا ایک بہترین اخلاقی صفت ہے لیکن یہ صفت بعض اوقات بزدلی اور نافہمی کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات مصائب و مشکلات کی صحیح سنگینی کا اندازہ نہ کرنے کی بنیاد پر، اسلام نے یہ چاہا ہے کہ یہ صفت مکمل شعور کے ساتھ پیدا ہو اور انسان یہ سمجھے کہ قوت تحمل کا مظاہرہ اس کا اخلاقی فرض ہے۔

مصیبت کو برداشت کر لینا ایک انسانی کمال ہے، لیکن اس شان سے استقبال کرنا گویا اسی کا انتظار کر رہے تھے اور پھر اس کو صداقت خدا اور رسول کی بنیاد قرار دے کر اپنے ایمان و تسلیم میں اضافہ کر لینا وہ اخلاقی کمال ہے جسے قرآن مجید اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

وَ كَأَيِّن مِن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُواْ لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ وَمَا ضَعُفُواْ وَمَا اسْتَكَانُواْ وَاللهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (۳)

اور جس طرح بعض انبیاء کے ساتھ بہت سے اللہ والوں نے جہاد کیا ہے اور اس کے بعد راہ خدا میں پڑنے والی مصیبتوں نے نہ ان میں کمزوری پیدا کی اور نہ ان کے ارادوں میں ضعف پیدا ہوا اور نہ ان میں کسی طرح کی ذلّت کا احساس پیدا ہوا کہ اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

آیت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے ذریعہ ایمان والوں کو اخلاقی تربیت دی جا رہی ہے اور انہیں ہر طرح کے ضعف و ذلت سے اس لیے الگ رکھا جا رہا ہے کہ ان کے ساتھ خدا ہے اور وہ انہیں دوست رکھتا ہے اور جسے خدا دوست رکھتا ہے نہ اسے کوئی ذلیل کر سکتا ہے اور نہ بیچارہ بنا سکتا ہے، یہی ارادی اخلاق ہے جو قرآنی آیات کا طرہ امتیاز ہے اور جس سے دنیا کے سارے مذاہب و اقوام بے بہرہ ہیں۔

وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (۴)

اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر (فروتنی سے) دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے گفتگو کریں تو کہتے ہیں: سلام

اس آیت میں بھی صاحبان ایمان اور عباد الرحمن کی علامت قوت تحمل و برداشت کو قرار دیا گیا ہے، لیکن "قالو اسلاماً" کہہ کر اس کی ارادیت اور شعوری کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ سکوت بر بنائے بزدلی اور بے حیائی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک اخلاقی فلسفہ ہے کہ وہ سلامتی کا پیغام دے کر دشمن کو بھی راہ راست پر لانا چاہتا ہیں۔

واضح رہے کہ ان تمام آیات میں صبر کرنے والوں کی جزا کا اعلان تربیت کا ایک خاص انداز ہے کہ اس طرح قوت تحمل بیکار نہ جانے پائے اور انسان کو کسی طرح کے خسارہ اور نقصان کا خیال نہ پیدا ہو بلکہ مزید تحمل و برداشت کا حوصلہ پیدا ہو جائے کہ اس طرح خدا کی معیت، محبت، فضل عظیم اور تحیہ و سلام کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے جو بہترین راحت و آرام اور بے حساب دولت و ثروت کے بعد بھی نہیں حاصل ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ وہ اپنی تعلیمات میں اس عنصر کو نمایاں رکھتا ہے اور مسلمان کو ایسا با اخلاق بنانا چاہتا ہے جس کی اخلاقیات صرف افعال، اعمال اور عادات نہ ہوں بلکہ ان کی پشت پر فکر، فلسفہ، عقیدہ اور نظریہ ہو اور وہ عقیدہ و نظریہ اسے مسلسل دعوت عمل دیتا رہے اور اس کی اخلاقیات کو مضبوط سے مضبوط تر بناتا رہے۔

جذبہ ایمانی

قوت تحمل کے ساتھ قرآن مجید نے ایمانی جذبات کے بھی نمونے پیش کیے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تحمل و حلم کو صرف منفی حدوں تک محدود نہیں رکھنا چاہتا ہے بلکہ مصائب و آفات کے مقابلہ میں ایک مثبت رخ دینا چاہتا ہے۔

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَى قَالَ آمَنتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَى قَالُوا لَن نُّؤْثِرَكَ عَلَى مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَايَانَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللهُ خَيْرٌ وَأَبْقَى (۵)

پس جادوگر سجدہ میں گر پڑے اور انہوں نے کہا کہ ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لے آئے تو فرعون نے کہا کہ ہماری اجازت کے بغیر کس طرح ایمان لے آئے بے شک یہ تم سے بڑا جادوگر ہے جس نے تم لوگوں کو جادو سکھایا ہے تو اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا اور تمہیں درخت خرما کی شاخوں پر سولی پر لٹکا دوں گا تا کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ کس کا عذاب زیادہ سخت تر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے، ان لوگوں نے کہا کہ ہم تیری بات کو موسیٰ کے دلائل اور اپنے پروردگار پر مقدم نہیں کر سکتے ہیں اب تو جو فیصلہ کرنا چاہے کر لے تو صرف اسی زندگانی دنیا تک فیصلہ کر سکتا ہے اور ہم اس لیے ایمان لے آئے ہیں کہ خدا ہماری غلطیوں کو اور اس جرم کو معاف کر دے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا اور بے شک خدا ہی عین خیر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

إِلاَّ تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُواْ ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لاَ تَحْزَنْ إِنَّ اللّهَ مَعَنَا فَأَنزَلَ اللّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُواْ السُّفْلَى وَكَلِمَةُ اللّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (٦)

اگر تم ان کی نصرت نہیں کرو گے تو خدا نے ان کی نصرت کی ہے جب انہیں کفار نے دو کا دوسرا بنا کر وطن سے نکال دیا کہ جب وہ غار میں تھے اور وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ رنج مت کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے تو خدا نے ان پر اپنی طرف سے سکون نازل کر دیا اور ان کی تائید ایسے لشکروں کے ذریعہ کی کہ جن کو تم نہیں دیکھ رہے اور کفار کے کلمہ کو پست قرار دیا اور اللہ کا کلمہ تو بہر حال بلند ہے اور اللہ صاحب عزت بھی ہے اور صاحب حکمت بھی ہے۔

مصیبت کو برداشت کر لینا ایک انسانی کمال ہے لیکن اس شان سے استقبال کرنا گویا اسی کا انتظار کر رہے تھے اور پھر اس کو صداقت خدا اور رسول کی بنیاد قرار دے کر اپنے ایمان و تسلیم میں اضافہ کر لینا وہ اخلاقی کمال ہے جسے قرآن مجید اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

آیت اولیٰ میں فرعون کے دور کے جادوگروں کے جذبہ ایمانی کی حکایت کی گئی ہے جہاں فرعون جیسے ظالم و جابر کے سامنے بھی اعلان حق میں کسی ضعف و کمزوری سے کام نہیں لیا گیا اور اسے چیلنج کر دیا گیا کہ تو جو کرنا چاہے کر لے، تیرا اختیار زندگانی دنیا سے آگے نہیں ہے اور صاحبان ایمان آخرت کے لیے جان دیتے ہیں انہیں دنیا کی راحت کی فکر یا مصائب کی پروا نہیں ہوتی ہے

دوسری آیت میں سرکار دو عالم کے حوصلہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اور صورت حال کی سنگینی کو واضح کرنے کے لیے ساتھی کا بھی ذکر کیا گیا جس پر حالات کی سنگینی اور ایمان کی کمزوری کی بنا پر حزن طاری ہو گیا اور رسول اکرم کو سمجھانا پڑا کہ ایمان و عقیدہ صحیح رکھو، خدا ہمارے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ خدا ہوتا ہے اسے کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے اور وہ ہر مصیبت کا پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے، اس کے بعد خدائی تائید اور امداد کا تذکرہ کر کے یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ رسول اکرم کا ارشاد صرف تسکین قلب کے لیے نہیں تھا بلکہ اس کی ایک واقعیت بھی تھی اور یہ آپ کے کمال ایمان کا اثر تھا کہ آپ پر کسی طرح کا حزن و ملال طاری نہیں ہوا اور آپ اپنے مسلک پر گامزن رہے اور اسی طرح تبلیغ دین اور خدمت اسلام کرتے رہے جس طرح پہلے کر رہے تھے

بلکہ اسلام کا دائرہ اس سے زیادہ وسیع تر ہوگیا کہ نہ مکہ کا کام انسانوں کے سہارے شروع ہوا تھا اور نہ مدینہ کا کام انسانوں کے سہارے شروع ہونے والا ہے، مکہ کا صبر و تحمل بھی خدائی امداد کی بنا پر تھا اور مدینہ کا فاتحانہ انداز بھی خدائی تائید و نصرت کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتا ہے۔

قرآن مجید کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ وہ اپنی تعلیمات میں اس عنصر کو نمایاں رکھتا ہے اور مسلمان کو ایسا با اخلاق بنانا چاہتا ہے جس کی اخلاقیات صرف افعال، اعمال اور عادات نہ ہوں بلکہ ان کی پشت پر فکر، فلسفہ، عقیدہ اور نظریہ ہو اور وہ عقیدہ و نظریہ اسے مسلسل دعوت عمل دیتا رہے اور اس کی اخلاقیات کو مضبوط سے مضبوط تر بناتا رہے۔

ادبی شجاعت

میدان جہاد میں زور بازو کا مظاہرہ کرنا یقیناً ایک عظیم انسانی کارنامہ ہے لیکن بعض روایات کی روشنی میں اس سے بالاتر جہاد سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق کا زبان پر جاری کرنا ہے اور شاید اس کا راز یہ ہے کہ میدان جنگ کے کارنامے میں بسا اوقات نفس انسان کی ہمراہی کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور انسان جذباتی طور بھی دشمن کی پروا ر کرنے لگتا ہے جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام نے عمرو بن عبدود کی بے ادبی کے بعد اس کا سر قلم نہیں کیا اور سینے سے اتر آئے تا کہ جہاد راہ خدا میں جذبات کی شمولیت کا احساس نہ پیدا ہو جائے لیکن سلطان جائر کے سامنے کلمہ حق کے بلند کرنے میں نفس کی ہمراہی کے بجائے شدید ترین مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں نفس انسانی کبھی ضائع ہوتے ہوئے مفادات کی طرف متوجہ کرتا ہے اور کبھی آنے والے خطرات سے آگاہ کرتا ہے اور اس طرح یہ جہاد "جہاد میدان" سے زیادہ سخت تر اور مشکل تر ہو جاتا ہے جسے روایات ہی کی زبان میں "جہاد اکبر" سے تعبیر کیا گیا ہے، جہاد باللسان بظاہر جہاد نفس نہیں ہے لیکن غور کیا جائے تو یہ جہاد نفس کا بہترین مرقع ہے خصوصیت کے ساتھ اگر ماحول ناسازگار ہو اور تختہ دار سے اعلان حق کرنا پڑے۔

قرآن مجید نے مرد مسلم میں اس ادبی شجاعت کو پیدا کرنا چاہا ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ مسلمان اخلاقیات میں اس قدر مکمل ہو کہ اس کے نفس میں قوت تحمل و برداشت ہو، اسکے دل میں جذبہ ایمان و یقین ہو اور اس کی زبان، اس کی ادبی شجاعت کا مکمل مظاہرہ کرے جس کی تربیت کے لیے اس نے ان واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُم بِالْبَيِّنَاتِ مِن رَّبِّكُمْ وَإِن يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِن يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُم بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (۷)

فرعون والوں میں سے ایک مرد مومن نے کہا جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا کہ کیا تم کسی شخص کو صرف اس بات پر قتل کرنا چاہتے ہو کہ جو اللہ کو اپنا پروردگار کہتا ہے جب کہ وہ اپنے دعوے پر کھلی ہوئی دلیلیں بھی لا چکا ہے۔ تو آگاہ ہو جاؤ اگر وہ جھوٹا ہے تو اپنے جھوٹ کا ذمہ دار ہے لیکن اگر سچا ہے تو بعض وہ مصیبتیں آسکتی ہیں جن کا وہ وعدہ کر رہا ہے، بے شک خدا زیادتی کرنے والے اور شک کرنے والے انسان کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں مرد مومن نے اپنے صریحی ایمان کی

پردہ داری ضروری ہے لیکن چند باتوں کا واشگاف اعلان بھی کر دیا ہے۔ جس کی ہمت ہر شخص میں نہیں ہوسکتی، یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ یہ شخص کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آیا ہے، یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ وہ اگر جھوٹا ہے تو تم اس کے جھوٹ کے ذمہ دار نہیں ہو، اور نہ تمہیں قتل کرنے کا کوئی حق ہے، یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ وہ اگر سچا ہے تو تم پر عذاب نازل ہوسکتا ہے، یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ یہ عذاب اس کی وعید کا ایک حصہ ہے ورنہ اس کے بعد عذاب جہنم بھی ہے، یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ تم لوگ زیادتی کرنے والے اور حقائق میں تشکیک کرنے والے ہو، اور ایسے افراد کبھی نہیں ہدایت یافتہ ہوسکتے اور ادبی شجاعت کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں ہوسکتا ہے کہ انسان فرعونیت جیسے ماحول میں اس قدر حقائق کے اظہار اور اعلان کی جرأت وہمت رکھتا ہو۔

انسان کی عظیم ترین اخلاقی صفات میں ایک صفت عفت نفس بھی ہے جس کا تصور عام طور سے جنس سے وابستہ کر دیا جاتا ہے، حالانکہ عفت نفس کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع تر ہے اور اس میں ہر طرح کی پاکیزگی اور پاکدامانی شامل ہے، قرآن مجید نے اس عفت نفس کے مختلف نمونے پیش کیے ہیں اور مسلمانوں کو اس کے وسیع تر مفہوم کی طرف متوجہ کیا ہے۔

جب مصر کی عورتوں نے انگلیاں کاٹ لیں اور عزیز مصر نے خواب کی تعبیر کے لئے جناب یوسف کو طلب کیا تو انہوں نے فرمایا کہ عورتوں سے دریافت کرو کہ انہوں نے انگلیاں کاٹ لیں اور اس میں میری کیا خطا ہے؟ عزیز مصر نے ان عورتوں سے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ خدا گواہ ہے کہ یوسف کی کوئی خطا نہیں ہے، تو عزیز مصر کی عورت نے کہا کہ یہ سب میرا اقدام تھا اور یوسف صادقین میں سے ہیں اور اب حق بالکل واضح ہو چکا ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت کریمہ میں پروردگار عالم نے اس مرد مومن کو مومن بھی کہا ہے اور اس کے ایمان کے چھپانے کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان ایک قلبی عقیدہ ہے اور حالات و مصالح کے تحت اس کے چھپانے کو کتمان حق سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے جیسا کہ بعض دشمنان حقائق کا وطیرہ بن گیا ہے کہ ایک فرقہ کی دشمنی میں تقیہ کی مخالفت کرنے کے لئے قرآن مجید کے صریحی تذکرہ کی مخالفت کرتے ہیں اور اپنے لیے عذاب جہنم کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ قَالَتِ امْرَأَةُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ (٨)

اس مقام پر عزیز مصر کی زوجہ کا اس جرأت وہمت سے کام لینا کہ بھرے مجمع میں اپنی غلطی کا اقرار کرلیا اور زنان مصر کا بھی اس جرأت کا مظاہرہ کرنا کہ عزیز مصر کی زوجہ کی حمایت میں غلط بیانی کرنے کے بجائے صاف صاف اعلان کر دیا کہ یوسف میں کوئی برائی اور خرابی نہیں، ادبی جرأت وشجاعت کے بہترین مناظر میں سے ہے جنکا تذکرہ کر کے قرآن مجید مسلمان کی ذہنی اور نفسیاتی تربیت کرنا چاہتا ہے۔

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ اتَّبِعُوا مَن لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُم مُّهْتَدُونَ وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ أَأَتَّخِذُ مِن دُونِهِ آلِهَةً إِن يُرِدْنِ الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَلَا يُنقِذُونِ إِنِّي إِذًا لَّفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ إِنِّي آمَنتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُونِ (٩)

اور شہر کے آخر سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کہا کہ اے قوم! مرسلین کی اتباع کرو، اس شخص کی اتباع کرو جو تم سے کوئی اجر بھی نہیں مانگتا ہے اور وہ سب ہدایت یافتہ بھی ہیں، اور مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اس خدا کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور تم سب اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہو، کیا میں اس کے علاوہ دوسرے خداؤں کو اختیار کرلوں جب کہ رحمٰن کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش کسی کام نہیں آسکتی ہے اور نہ یہ بچا سکتے ہیں، میں تو کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا، بے شک میں تمہارے خدا پر ایمان لا چکا ہوں، لہٰذا تم لوگ بھی میری بات سنو۔!

آیت کریمہ میں اس مرد مومن کے جن فقرات کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ادبی شجاعت کا شاہکار ہیں، اس نے ایک طرف داعی حق کی بے نیازی کا اعلان کیا کہ وہ زحمت ہدایت بھی برداشت کرتا ہے اور اجرت کا طلبگار بھی نہیں ہے، پھر اس کے خدا کو اپنا خالق کہہ کر متوجہ کیا کہ تم سب بھی اسی کی بارگاہ میں جانے والے ہو تو ابھی سے سوچ لو کہ وہاں جا کر اپنی ان حرکتوں کا کیا جواز پیش کرو گے، پھر قوم کے خداؤں کی بے بسی اور بے کسی کا اظہار کیا کہ یہ سفارش تک کرنے کے قابل نہیں ہیں، ذاتی طور پر کونسا کام انجام دے سکتے ہیں، پھر قوم کے ساتھ رہنے کو ضلال مبین اور کھلی ہوئی گمراہی سے تعبیر کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ میں جس پر ایمان لایا ہوں وہ تمہارا بھی پروردگار ہے، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اپنے پروردگار پر تم بھی ایمان لے آؤ اور مخلوقات کے چکر میں نہ پڑو۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَى فَبَغَى عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (۱۰)

بے شک قارون کا تعلق موسیٰ کی قوم سے تھا پھر وہ ان سے سرکش ہو گیا اور ہم نے قارون کو اس قدر خزانے دیے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کے لیے بھی بارگراں تھیں، جب اس کی قوم نے اس سے کہا: اترا نا مت یقینا اللہ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا، اور جو (مال) اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر حاصل کر، البتہ دنیا سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر اور احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد نہ کر یقینا اللہ فسادیوں کو پسند نہیں کرتا۔

آیت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قارون کے بے تحاشہ صاحب دولت ہونے کے باوجود قوم میں اس قدر ادبی جرأت موجود تھی کہ اسے مغرور اور مفسد قرار دے دیا، اور یہ واضح کر دیا کہ خدا مغرور اور مفسد کو نہیں پسند کرتا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ دولت کا بہترین مصرف آخرت کا گھر حاصل کر لینا ہے ورنہ دنیا چند روزہ ہے اور فنا ہو جانے والی ہے۔

عفت نفس

انسان کی عظیم ترین اخلاقی صفات میں ایک صفت عفت نفس بھی ہے جس کا تصور عام طور سے جنس سے وابستہ کر دیا جاتا ہے، حالانکہ عفت نفس کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع تر ہے اور اس میں ہر طرح کی پاکیزگی اور پاکدامانی شامل ہے، قرآن مجید نے اس عفت نفس کے مختلف نمونے پیش کیے ہیں اور مسلمانوں کو اس کے وسیع تر مفہوم کی طرف متوجہ کیا ہے۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لاَ يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (۱۱)

اور زلیخا نے یوسف کو اپنی طرف مائل کرنے کی ہر امکانی کوشش کی اور تمام دروازے بند کرکے یوسف کو اپنی طرف دعوت دی لیکن انہوں نے برجستہ کہا کہ پناہ بخدا وہ میرا پروردگار ہے اور اس نے مجھے بہترین مقام عطا کیا ہے اور ظلم کرنے والوں کے لیے فلاح اور کامیابی نہیں ہے۔

ایسے حالات اور ماحول میں انسان کا اس طرح دامن بچا لینا اور عورت کے شکنجے سے آزاد ہوجانا عفت نفس کا بہترین کارنامہ ہے، اور الفاظ پر دقت نظر کرنے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یوسف نے صرف اپنا دامن نہیں بچا لیا بلکہ نبی خدا ہونے کے رشتہ سے ہدایت کا فریضہ بھی انجام دے دیا اور زلیخا کو بھی متوجہ کردیا کہ جس نے اس قدر شرف اور عزت سے نوازا ہے وہ اس بات کا حق دار ہے کہ اس کے احکام کی اطاعت کی جائے اور اس کے راستے سے انحراف نہ کیا جائے اور یہ بھی واضح کردیا ہے کہ اس کی اطاعت سے انحراف ظلم ہے اور ظلم کبھی بھی کامیاب اور کامران نہیں ہوسکتا ہے۔

لِلْفُقَرَاء الَّذِينَ أُحصِرُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ لاَ يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاء مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لاَ يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُنفِقُواْ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّهَ بِهِ عَلِيمٌ (۱۲)

ان فقراء کے لیے جو راہ خدا میں محصور کردیے گئے ہیں اور زمین میں دوڑ دھوپ کرنے کے قابل نہیں ہیں، ناواقف انہیں ان کی عفت نفس کی بنا پر مالدار کہتے ہیں حالانکہ تم انہیں ان کے چہرے کے علامات سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں کے سامنے دست سوال نہیں دراز کرتے ہیں حالانکہ تم لوگ جو بھی خیر کا انفاق کروگے خدا تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

جنسی پاکدامنی کے علاوہ یہ عفت نفس کا دوسرا نمونہ ہے جہاں انسان بدترین فقر و فاقہ کی زندگی گزارتا ہے جس کا اندازہ حالات اور علامات سے بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے باوجود اپنی غربت کا اظہار نہیں کرتا اور لوگوں کے سامنے دست سوال نہیں دراز کرتا کہ یہ انسانی زندگی کا بدترین سودا ہے، دنیا کا ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ آبرو کی قیمت مال سے زیادہ ہے اور مال آبرو کے تحفظ پر قربان کردیا جاتا ہے، بنابریں آبرو دے کر مال حاصل کرنا زندگی کا بدترین معاملہ ہے جس کے لیے کوئی صاحب عقل و شرف امکانی حدود تک تیار نہیں ہوسکتا، اضطرار کے حالات دوسرے ہوتے ہیں وہاں ہر شرعی اور عقلی تکلیف تبدیل ہوجاتی ہے۔

واذا خاطبهم الجاهلون قالو سلاماً۔

جب جاہل ان سے جاہلانہ انداز سے خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کا پیغام دے دیتے ہیں

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا (۱۳)

اللہ کے نیک اور مخلص بندے وہ ہیں جو گناہوں کی محفلوں میں حاضر نہیں ہوتے ہیں اور جب لغویات کی طرف سے گزرتے ہیں تو نہایت شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں اور ادھر توجہ دینا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں۔

ان فقرات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ''عبادالرحمان'' میں مختلف قسم کی عفت نفس پائی جاتی ہے، جاہلوں سے الجھتے نہیں ہیں اور انہیں بھی سلامتی کا پیغام دیتے ہیں، رقص و رنگ کی محفلوں میں حاضر نہیں ہوتے ہیں اور اپنے نفس کو ان خرافات سے بلند رکھتے ہیں، ان محفلوں کے قریب سے بھی گزرتے ہیں تو اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اور شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں تاکہ دیکھنے

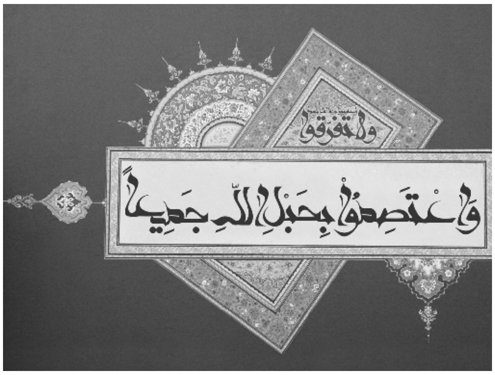

والوں کو بھی یہ احساس پیدا ہو کہ ان محفلوں میں شرکت ایک غیر شریفانہ اور شیطانی عمل ہے جس کی طرف شریف النفس اور عباد الرحمان قسم کے افراد توجہ نہیں کرتے ہیں اور ادھر سے نہایت درجہ شرافت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷
۲۔ سورہ احزاب ۲۲
۳۔ سورہ آل عمران ۱۴۶
۴۔ سورہ فرقان ۶۳
۵۔ سورہ طہ ۷۰ تا ۷۳
۶۔ سورہ توبہ ۴۰
۷۔ سورہ غافر ۲۶
۸۔ یوسف ۵۱
۹۔ سورہ، آیت یٰس ۲۰
۱۰۔ سورہ قصص، آیت ۷۶۔۷۷
۱۱۔ سورہ یوسف، آیت ۲۳
۱۲۔ سورہ بقرہ ۲۷۳
۱۳۔ سورہ فرقان ۷۳

قرآن مجید میں عبادت کا فلسفہ

قرآن کی نظر میں نماز کا فلسفہ یاد خدا ہے

اقم الصلاۃ لذکر (۱)

اور خدا کا ذکر دلوں کے سکون کا باعث ہے

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (۲)

اور قلبی سکون کا نتیجہ عالم ملکوت میں پرواز ہے

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجع الی ربک (۳)

دوسرے مقام پر قرآن نے عبادت کی وجہ شکر پروردگار قرار دیا ہے۔

أعبدوا ربّکم الذی خلقکم (۴)

اپنے پروردگار کی عبادت کرو کہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے۔

فلیعبدوا ربّ ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع و آمنھم من خوف (۵)

پس اس گھر (خانہ کعبہ) کے پروردگار کی عبادت کریں کہ اس نے انہیں بھوک و پیاس سے نجات دی۔

بعض آیتوں میں یہ اشارہ ہے کہ نماز تربیت کا کام کرتی ہے۔

انّ الصلاۃ تنھیٰ عن الفحشاء و المنکر (۶)

بیشک نماز برائیوں اور منکرات سے روکتی ہے۔

قرآن مجید نماز کی تاکید کرنے کے بعد فرماتا ہے:

ان الحسنات یذھبن السیّئات (۷)

بیشک اچھے کام گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں۔

پس اس لحاظ سے نماز گزشتہ گناہوں سے ایک عملی توبہ ہے اور پروردگار عالم اس آیت کے ذریعہ گنہگاروں کو امید دلاتا ہے کہ اگر اچھے کام، جیسے نماز و عبادات بجالاؤ گے تو خدا تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا۔

۱۔ سورہ طہ، آیت ۱۴ ۔ ۲۔ سورہ رعد، آیت ۲۸
۳۔ سورہ فجر، آیت ۲۸ ۔ ۴۔ سورہ نساء، آیت ۱
۵۔ سورہ قریش، آیت ۲ ۔ ۶۔ سورہ عنکبوت، آیت ۴۵
۷۔ سورہ ہود، آیت ۱۱۴